Existential Study Of Anthology Of Dr Iftikhart Baig "Dard Lafzon Mai Sans Laita Ha"

ڈاکٹر افتخار بیگ کے شعری مجموعے "درد لفظوں میں سانس لیتا ہے" کا وجودیاتی مطالعہ

Dr. Sadia Kanwal*[1]
Lecturer, Department Of Urdu , Women University, Mardan.
Dr. Muhammad Amjad Kallu *[2]
Research Scholar, Department Of Urdu, IIU Islamabad.

ڈاکٹر سعدیہ کنول☆[1]
لیکچرر، شعبہ اردو، ویمن یونیورسٹی، مردان
ڈاکٹر محمد امجد کلو☆[2]
ریسرچ سکالر، شعبہ اردو، انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی ، اسلام آباد

Correspondance: umeedekanwal23@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 15-10-2025
Accepted:22-12-2025
Online:31-12-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT:This research paper undertakes a critical and analytical examination of Dr. Iftikhar Baig's poetic collection *Dard Lafzon Mein Saans Leta Hai* within the philosophical and literary framework of existentialism, while simultaneously exploring its nuanced engagement with Urdu literary tradition. The study investigates how the poet grapples with the existential dilemmas of alienation, despair, freedom, and the search for meaning in a seemingly indifferent world. Through the lens of existential philosophy—particularly the works of Kierkegaard, Sartre, and Camus—the research elucidates how Dr. Baig's verse transcends personal anguish to reflect a broader human condition shaped by existential anxiety.

Furthermore, the paper contextualizes Baig's modern poetic voice within the continuum of

Urdu poetic tradition, engaging critically with classical and modern forms, especially the transition from romanticism to philosophical realism. The poet's reconfiguration of traditional metaphors, idioms, and imagery reflects a profound ontological crisis, making his work a unique confluence of individual subjectivity and collective cultural memory. Employing qualitative content analysis, intertextual references, and hermeneutic methodology, this study aims to illuminate how Baig's poetry embodies a dynamic dialogue between tradition and modern existential thought, thereby enriching the corpus of contemporary Urdu literature.

KEYWORDS:Existentialism, Modern Urdu Poetry, Tradition and Innovation, Philosophical Realism,Ontological Crisis

جدید اردو نظم کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں ہوا جیسے جدیدیت کا رجحان کہا جاتا ہے۔ مغرب میں جدیدیت کی پہلی کھیپ کے ادیبوں نے ہر شے سے انکار کیا اور تصور علامتیت تک پہنچ گئے۔ مگر دوسری کھیپ کے ادیبوں نے اس روایت کا صحت مند استعمال پر زور دیا۔ جدید شعراء نے درج ذیل سوالات اٹھائے۔

ا۔ یہ کائنات کیا ہے؟

۲۔ میں کون ہوں؟

۳۔ معاشرہ کیا ہے؟

۴۔ سب کا آپس میں رشتہ کیا ہے؟

جدید شعراء کے ہاں ہمیں روح کے تحفظ سے زیادہ جسم کے تحفظ کا حوالہ کافی مضبوط ہے۔ اس جدید تحریک کو "لسانی تشکیلات" کی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان تحریک کے شعراء نے نئے الفاظ رائج کرنے کی کوشش کی۔ لہذا بہت سے نامانوس الفاظ نظم میں شامل ہوگئے۔ ان شاعروں کے نزدیک لفظ کی اہمیت بنیادی ہے۔ خیال لفظ کے توسط سے آگے

بڑھتا ہے۔ افتخار جالب کا خیال ہے کہ ہم لفظ کے حوالے سے کب تک محدود دائرے میں بند رہیں گے۔ اور کب تک یہ گرامر والے ہم پر حکومت کرتے رہیں گے۔ لہذا نیا لسانی نظام وضع کرنا چاہیے۔

اس تحریک کے روح رواں افتخار جالب اور جیلانی کامران کو قرار دیا جاتا ہے۔ افتخار جالب نے اپنی نظموں کے مجموعے "ماخذ" کے دیباچے اور جیلانی کامران نے اپنے مجموعے "استانزے" کے دیباچے میں ساٹھ کی دہائی کی جدید نظم کی نظریہ سازی کرنے کی کوشش کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نئی نظم اور نئی شاعری کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس تجربے کی مخالفت اور حمایت میں بے شمار مضامین لکھے گئے۔

جدیدیت کا نظریہ ایک نقطہ نظر سے مارکسزم کے نقطہ نظر سے قریب تر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مارکسزم میں صرف معاشیات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جدیدیت کے حوالے سے معاشیات ایک جز ہے عمومی طور پر کوئی فلسفیانہ اور نظریاتی بحث جو زندگی کے حوالے سے فرد، سماج اور کائنات کے متعلق نئی بصیرتوں کی داعی ہو جدیدیت کے زمرے میں آتی ہے ۔ شعر و ادب کی دنیا میں جمالیاتی جدیدیت کو اہمیت حاصل ہے۔ اس میں بہت سے رجحانات کار فرما رہے ہیں۔ شعر و ادب کو مختلف نظریات کی مدد سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ ان میں تعمیریت، سیر یلزم، ڈاڈا ازم، وجودیت، مستقبلیات، اظہاریت، علامتیت، اور شعور کی رو وغیرہ شامل ہے۔ یہ وہ تمام نظریات و تصورات ہیں جن کی روشنی میں ادب اور ادبی رویوں کی تفہیم کی کوشش کی جاتی ہے۔

جدید نظم میں سب سے اہم نظریہ وجودیت کا ہے جس نے ہمارے شعر و ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وجودیت ہمارے عہد کا فکری مرقع ہے۔ خاص طور پر مغرب میں اس دور میں پیدا ہونے والی بے چینی، کشیدگی، اور عظیم جنگوں میں ہتھیاروں کے استعمال کے نتیجے میں جو سماجی صورت حال سامنے آئی۔ اس میں مذہب اور روحانیت کا زوال کی وجہ سے وجودی فلسفے کو فروغ حاصل ہوا۔ وجودی فلسفے کی بنیاد بننے والے اسباب میں مایوسی، بغاوت، مادہ پرستی، عدم تحفظ کا احساس، سیاسی، سماجی، اخلاقی، اور مذہبی وغیرہ کی پامالی شامل ہے۔ وجودی فلسفے کے مفکرین کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک مذہبی، اس مذہبی گروہ میں گابریل مارشل، کریگارڈ، اور رچرڈ کرونز شامل ہیں۔ جبکہ لادینی گروہ میں نمایاں مفکر ژاں پال سارتر اور مارٹن ہیڈیگر شامل ہیں۔ کریگارڈ کو وجودیت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے وجودیت کا فلسفہ پیش کیا۔ ۱۸۸۹ء میں گابریل مارشل نے لفظ "وجودیت" بطور اصطلاح استعمال کیا۔

اردو میں وجودیت کا نظریہ مغرب کی تحریکوں کے ساتھ آیا۔ یہ دور جدیدیت کی پیداوار ہے۔ جب بھی کوئی نظریہ یا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تو ان کی اصطلات کے تراجم کرنا بے حد مشکل امر ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ نہ صرف اردو بلکہ دیگر زبانیں انگریزی، عربی، فارسی، وغیرہ کو بھی ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وجودیت کے لفظ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر افتخار بیگ لکھتے ہیں۔

> " اردو میں وجودیت کی اصطلاح Existantialism کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ لفظ Existance کا ترجمہ "وجود" کیا گیا اور وہی لفظ یعنی "وجود"

> اصطلاح اردو میں مروج ہے۔ لفظ Existance لغوی اعتبار سے لاطینی کے لفظوں کا مجموعہ ہے یعنی لفظ Ex جس کے معنی ہیں out اور لفظ sistere مشتق ہے لفظ stare سے جس کے معنی ہیں To stand اب آیئے انگریزی الفاظ کے معنی کی طرف out stand محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں نمایاں۔ جیسے ابھی کرنا باقی ہو۔ stand out کے معنی ہیں میں نمایاں ہوتا۔ کے خلاف ڈٹ جانا۔ آخر تک قائم رہنا۔" (1)

اس اقتباس میں ڈاکٹر افتخار بیگ بھی لفظ Existantialism کا ترجمہ وجودیت ہی کرتے ہیں اسی طرح شاہین مفتی، قاضی عابد، شیما مجید، اپنی کتابوں اور ڈاکٹر جمیل اختر محبی میں وجودیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ مگر علی عباس جلال پوری نے لفظ موجود بطور اسم کیفیت اور "موجودیت" بطور اصطلاح علم استعمال کیا۔ وجود کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کر کیگارڈ لکھتا ہے کہ:

> "وجود کی پیدائشی مشکل، جس سے فرد دوچار ہوتا ہے ایک ایسی مشکل ہے جس کا حقیقی اظہار، مجرد خیال کی لسان میں کبھی بھی نہیں ہوتا۔ اس مشکل کی وضاحت کم ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ ٹھوس اور زمانی وجودی عمل ایک مجرد خیال ہے۔ جو ایک ناظر کے نقطہ نگاہ سے اوجھل ہوتا ہے۔ فرد موجود کی زمانی اور ابدی ترکیب کی خطرناک صورتحال جو اس کی ہستی سے ابھرتی ہے، وجود میں واقع ہے۔ (2)

کہ فلسفہ وجودیت انفرادی زندگی کے متعلق ہے، اس میں فرد کا انفرادی شعور، آگہی، جذبات و احساسات وغیرہ ہی فرد کے وجود کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ ہم کہ سکتے ہیں کہ فلسفہ وجودیت اُس عہد کے مروجہ فلسفے صنعتی اور مشینی زندگی اور مخصوص سیاسی و سماجی حالات کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ اس تحریک نے ایک لمبے عرصے مغرب کے لوگوں کو اپنا اسیر بنائے رکھا کیوں کہ یہ تحریک بحرانی دور کی پیداوار تھی۔ اس لیے دنیا کے ہر خطے کے لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ رینا ڈیکارٹ فرد کی آزادی کے قائل تھے۔ وہ لکھتے ہیں میں سوچتا ہوں اس لیے کہ میں وجود رکھتا ہوں اسی طرح سارتر وجود کو جوہر پر مقدم قرار دیتا ہے۔ یعنی فرد کا وجود اس کی خوبیوں اور خامیوں سے زیادہ اہم ہے۔ فرد کا ہونا اہم بات ہے فرد اپنے وجود کے حوالے سے تمام تر اعمال اور امکانات کا نہ صرف خود ذمہ دار ہے بلکہ اعمال یا فیصلہ کے نتیجے ہونے والے واقعات کا بھی خود ذمہ دار ہے۔

ڈاکٹر افتخار بیگ کا شعری مجموعہ "درد لفظوں میں سانس لیتا ہے" ان کی شاعری کی دوسری کتاب ہے۔ ان کی فن کا اعجاز یہ ہے۔ کہ انھوں نے اپنی شاعری کے لب لباب کو کتاب کے عنوان کے چھ لفظوں میں سمو کر رکھ دیا۔ یہ کتاب موصوف

کے اسی بیان کی ایک عمدہ تفسیر ہے۔ افتخار بیگ کا تعلق جدیدیت اور انقلاب کا پرچار کرنے والے قبیلے سے ہے وہ خود برملا طور پر اپنے انقلاب پسند اور جدیدیت کے پرچارک ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ اسی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"مجھے تسلیم ہے کہ گرد ہوئی ہوئی عمر رواں کی تپتی راہوں میں روایت سب سے بڑی دیوار ہے جو تہذیب، اخلاق اور مذہب کی اساس پر استوار ہے۔ یہ ایک ایسا حصار اور ایسا زنداں ہے جس میں شاید رسانیت، رچاؤ اور چاشنی بہت ہے--------چکا چوند روشنیاں کہ آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں---------مگر یہ آنکھیں اتنی تاب کہاں رکھتی ہیں، پھر روایت ہی دکھتی ہے۔ لمحہ موجود اور مستقبل اوجھل ہو جاتے ہیں۔ روشنی بھی تو بینائیاں چھین لیا کرتی ہے۔ میں اس لمحے سے ڈرتا ہوں کہ میری بینائی مجھ سے چھن جائے ہو میں روایت کی حدوں کو پھلانگنا اور اپنے لیے نئی قدریں تراشنا چاہتا ہوں۔"(3)

افتخار بیگ نے اپنے لیے نئی قدریں تراشیں، جن کی شہادت ان کی پوری شاعری مہیا کرتی ہے۔ جہاں تک ہئیت کا تعلق ہے تو انہوں نے اظہار کے لیے نظم آزاد کو چنا۔ آزاد نظم میں قافیہ ردیف کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے خیال کے مختلف زاویوں پر پیچ و خم کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس کے اندر موجود آہنگ اس میں ایک روانی پیدا کرتا ہے۔ جس میں لطف کے ساتھ ساتھ بیان میں تاثیر کی شدت بھی پیدا ہوتی ہے۔ نظم میں روانی اور تاثیر دیکھیے:

اے عروس جہاں------!
ڈھونڈنے تجھ کو بستی میں نکلا تھا وہ
وہ جو پاگل تھا، دیوانہ سودائی تھا
ہر گلی میں پھرا
بس بلکتا، سسکتا مچلتا رہا
تنگ بستی میں کوئی بھی ایسا نہ تھا
شیریں لفظوں کی چھیاں جو دیتا اسے
تپتے سورج تلے---جلتے تلوے لیے
سر برہنہ، بھٹکتا رہا ہر طرف
ہر گلی بند تھی
اور حرماں نصیبی کے آسیب کا ناچتا خوف تھا
آخرش تھک گیا---

اِک شکستہ سے احساس کا بوجھ تھا

اس کے مدقوق کاندھوں پر جو بوجھ تھا

وہ بھٹکتا رہا۔۔۔بس بھٹکتا رہا

جانِ آسودگی!تو ملی نہ رہے

تو ملی نہ اسے!

(کہاں ہے زندگی)(4)

اس نظم میں " شیریں لفظوں کی چھپاں "کی علامت کا استعمال کیا جو ان سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا اس لیے انہیں جدیدیت کے حامی شعرا جو نئے لفظوں کے استعمال پر یقین رکھتے ہیں، میں شمار کیا جاتا ہے۔وجودیت جدیدیت کی ایک قسم ہے۔وجودی فلاسفرز کے نزدیک وجود کی اہمیت سب سے پہلے ہے اس کی خوبیاں اور خامیاں بعد میں آتی ہیں۔فرد جو عمل اختیار کرتا ہے۔اس عمل کی ذمہ داری اس کی ذاتی ہے۔ذاتی عمل کے نتیجے میں نتیجہ اچھا آئے یا بُرا۔اس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔انسانی زندگی نشیب و فراز کا مرقع ہے۔حادثات اور واقعات میں تبدیلی فرد کی اپنی مرضی سے نہیں ہوتی۔اس لیے آنے والے ناگہانی حادثات سے انسان خود نبرد آزما رہتا ہے۔یہ حادثات اسے آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔چونکہ فرد کی ماہیت پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی اس لیے وہ خود اپنی ماہیت کو طے کرتا ہے۔یہی اس کی آزادی ہے فرد نئے جہانوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ہر روز اسے اپنے لیے بہت سے فیصلے لینے پڑتے ہیں۔بھرپور فیصلہ،پرجوش عمل اور دونوں کی لامحدود آزادی کا نام وجود ہے۔بقول سارتر

" انسان پہلے وجود میں آتا ہے۔اپنی ذات کا سامنا کرتا ہے۔کائنات میں رنگ ابھرتا ہے اور پھر کہیں اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہے۔(5)

وجود ہمیشہ سے شعور کا حامل ہوتا ہے۔مگر اپنے آپ کو خالی تصور کرتا ہے وہ ہمیشہ چاہتا ہے۔کہ خود کو مکمل کرے اور وجود کی یہ مجبوری ہے۔وہ خود کو دوسروں سے ماورا اور الگ ثابت کرنا چاہتا ہے فرد اپنے جوہر کے حوالے سے اپنا اثبات ذات تلاش کرتا ہے اور عقل کو بنیاد تسلیم کرتا ہے۔عقل کی بنیاد پر جب وہ کوئی فیصلہ لیتا ہے۔تو پھر وہ تنہا اکیلا اس فیصلے کا ذمہ دار ہے۔ڈاکٹر افتخار بیگ کے ہاں اثبات ذات کا تصور کرب کی صورت نظر آتا ہے۔وہ اپنے تجربوں سے آنے والی نسلوں کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ جن مشکلات دکھ اور کرب سے میں گزار تم نہ گزرو ان کی نظم "یہ تاباں سویروں کا سستا سا سودا" نظریاتی اعتبار سے مثبت رویوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔بنیادی طور پر اندھیروں کے خوف سے جینے،سسکنے اور سلگنے کا تذکرہ کرتی ہے۔شاعر نے معنوی اعتبار سے اس کو پرتوں میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔

سنو!شہر والو۔۔۔۔۔

یہ تاباں سویروں کا سودا

بس امسال سستا ہے۔۔۔لینا ہے لے لو

یہ قمیت ہی کیا ہے

یہی زندگانی۔۔۔۔

کہ جو گھور تاریکیوں میں سسکتی تڑپتی رہی ہے

یہی چار سانسیں۔۔۔ کہ جو سسکنوں سے عبارت ہوئی ہے؟

یہ قمیت ہی کیا ہے؟

یہ انمول صبحوں کا سودا

اگر یوں ملے تو۔۔۔۔ یہ مہنگا نہیں ہے

جو لینا ہے لے لو

وگرنہ ہمیشہ اندھیروں میں جینے، سسکنے، سلگنے

کا اک آخری فیصلہ سارے کر لو(6)

یہ نظم مکالماتی انداز میں لکھی گئی شاعر شہر والوں سے مخاطب ہے۔ کہ جن اندھیروں کا سامنا اس نے خود کیا ہے۔ وہ ہماری آئندہ آنے والی نسل کو نہ سہنے پڑیں۔ اس لیے شاعر اس کو سستا سودا کہتا ہے۔ کہ یہ تمھارے ان نظر نہ آنے والے اندھیروں کو ہمیشہ کے لیے دور کر دے گا۔ اور پھر روشن صبح تمھارا مقدر ہو گی۔ اندھیروں کا خوف دراصل معاشرے کی مختلف سماجی بُرائیاں اور علم سے دوری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی اخلاقی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی خوف انسان کو ہر وقت جکڑے رکھتے ہیں۔ یہ نظم زندگی کے ان آنے والے دکھوں کے تناظر میں کہی، دراصل شاعر خود کرب کی کیفیت سے گزرنے کے بعد اثبات ذات کا فلسفہ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ جس پر چل کر وہ دنیا میں دوسروں کے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے اسی تناظر میں ایک اور نظم دیکھیے:

میرے ہمراہیو! اب تو یہ مان لو۔۔۔۔!

منزلوں کے فسانے، فسانے ہی تھے

ہم دوانے ہی تھے

ہم نے برسوں تلک۔۔۔۔۔ زندگی کے بہیمانہ اطوار کو

راستوں کا فسوں جان کر سہہ لیا

ہم جو تلووں میں مہندی سجا کر چلے

ظلمتوں سے لڑے

جبر کے سامنے۔۔۔۔۔۔۔۔ جب ڈٹے تو پہاڑوں کو شرما دیا عزم آہن بنا۔

حوصلوں نے فضاؤں کو گرما دیا

سر پہ، راہوں میں پھیلی ہوئی تیرگی

اور ظلمت میں لپٹی ہوئی دوریاں

نہ کٹیں------نہ کٹیں

منزلوں کے فسانے، فسانے ہی تھے

میرے ہمراہیو! اب تو یہ مان لو--------------!

(میرے ہمراہیو-----------!)(7)

منزل پر پہنچنے کے بعد ہر چیز بے معنی ہو جاتی ہے حتیٰ کہ خود منزل بھی۔ میرے دوستو! اب یہ بات ہم سب کو مان لینی چاہیے کہ منزلوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی یہ بس راستے ہیں جن پر ہم چلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ گمنام وادیوں میں جا کے سو جاتے ہیں۔ منزلیں فقط خواب ہیں جبکہ راستے حقیقت ہیں۔ ہم زندگی کے ہر نشیب و فراز کا مقابلہ یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ آگے منزل ہے جبکہ منزل کا کوئی نشاں بھی نہیں ہوتا اور جب منزلوں پر پہنچ کر سرخوشی کا احساس نہ ملے تو ایک کرب وجود کر اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ تو پھر آزادیٔ عمل اور انتخاب فرد کے لیے اتنا تلخ ہو جاتی ہے۔ کہ سارتر کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ انسان کو آزادی کی سزا ملی ہے۔ ذمہ داری کا احساس ہی دراصل ایک بڑا کرب ہے۔ یہ وہ بوجھ ہے جسے فرد نے ہر حال میں اٹھاتا ہے۔

کرب یادہشت کا تصور ہمیں کرکیگارڈ کے ہاں ملتا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت سامنے آتی ہے۔ جب وہ آدمؑ کے اولین گناہ پر بات کرتا ہے جب آدمؑ کو آگہی دی گئی کہ اس درخت کے پھل کو کھانا منوع ہے۔ تو یہ ممانعت ہی ان کے اندر آزادی کے امکانات کو اجاگر کرتی ہے۔ اور ہر فرد کی زندگی میں ایسا لمحہ ضرور آتا ہے۔ جب وہ اپنی ذات کی پہچان کے لیے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی مثال سارتر اپنی کتاب میں کرکیگارڈ کے ہاں حضرت ابراہیمؑ کی مثال سے اس نکتے کی وضاحت یوں کرتا ہے:

> "یہی وہ کرب ہے جسے کرکیگارڈ نے "کرب ابراہیمی" سے موسوم کیا تھا۔
> آپ کو وہ قصہ تو معلوم ہی ہو گا ایک فرشتے نے ابراہیمؑ کو اپنا بیٹا قربان
> کرنے کا حکم دیا تھا" اب اگر وہ واقعی فرشتہ تھا جس نے ظاہر ہو کر یہ حکم دیا
> تھا کہ اے ابراہیمؑ تو اپنے بیٹے کو قربان کر"(8)

سارتر ابراہیمؑ کے کرب کو کرب ابراہیمی کا نام دیتا ہے۔ بیٹے کو قربان کرنے کا فیصلہ کرنا اتنا آسان نہیں وہ جس دکھ اور کرب کی کیفیت سے گزرے اس کا انجام نہایت خوبصورت نکلا کرب سے گزرے کے بعد فرد کے ہاں مضبوطی اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی ذات میں مثبت تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

شاعری کی اساس زندگی ہوتی ہے۔ اس لیے زندگی میں نفرتیں جن منافقتوں اور ریاکاریوں کا سامنا فرد کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کے نتیجے میں فرد کے ہاں کرب یادہشت کی صورتحال جنم لیتی ہے۔ ڈاکٹر افتخار بیگ کے ہاں کرب کی کیفیت ان کی

بہت سی نظموں میں سامنے آتی ہے۔ انسان اس دھرتی پر سب سے زیادہ دکھ، درد، آلام اور مصائب کا سامنا کرتا ہے۔ اور ان سے نجات کا کوئی بھی ذریعہ نہیں۔

تم کیا جانو۔۔۔۔؟
دھرتی کی آفات کے بارے
آنسو، آنسورات کے بارے
ہم تو تنہا رہتی ہیں، بس
یونہی روتی پھرتی ہیں، بس
ایک سفر ہے اپنا جیون
دکھ میں ڈوبی ہر اک دھڑکن
دونوں اور فصیلیں اپنے
سارا جیون ان کو ڈھاتے رہنا
اور دکھ سہنا
بس مقسوم یہی ہے اپنا
سات فصیلیں ڈھا کر دیکھیں
اپنی قید نہ ہاری پھر بھی
ہم ہیں دکھ کی ماری پھر بھی
(کرب مسلسل)(9)

نظم کے عنوان سے شاعر کے کرب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک تو کرب وہ بھی مسلسل، اس نظم میں شاعر اس بات کی وضاحت کرتا ہے۔ کہ ہمارا سارا جیون دکھ درد سہنے اور اس کی قید کے چنگل سے نکلنے میں لگتا ہے۔ لیکن پھر ہم اس سے رہائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی دکھ درد میں مبتلا ہے۔ دکھ درد صرف ذات کے نہیں ہوتے بلکہ ایک اچھا شاعر معاشرے میں ہونے والے المناک واقعات سے بھی بے چین و بے قرار ہو جاتا ہے۔ جیسے اس نظم "خدایا تیری ہر سو دھوم" میں تھل کے ریگستان کے مکینوں کے دکھ پر بلبلا اٹھے۔

وفا کا ایسا قتل عام
کہ لرزیں پربت خوف کے مارے
بھوکوں بلکیں بچے سارے
تھل کی جلتی ریت ہے ہر سو
پیاسا ہر اک کھیت ہے ہر سو

اپنی رحمت تو برسا دے

بھوبل بھوبل مٹی ساری

دل پہ ایسا خوف ہے طاری

جیسے پتھر بھاری بھاری

ہر دہلیز لہو میں ڈوبی

(خدایا۔۔۔۔! تیری ہر سو دھوم)(10)

ایک اور درد میں لپٹی ہوئی نظم ملاحظہ کیجئے:

میں نے کن درد زمانوں کی سزا کاٹی ہے

سبز آنکھوں کا سمندر ہے میرے چاروں طرف۔۔۔۔

ڈوبنا درد ہے۔۔۔۔

ساحل کی تمنائیں بھی درد

میں نے کن درد زمانوں کی سزا کاٹی ہے،

(سارا جیون درد)(11)

سبز آنکھوں کا سمندر علامت ہے۔ کٹاس راج مندر کے تالاب میں موجود پانی کا رنگ سبز ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بھگوان شیو دیوتا کے آنسوؤں سے بنا ہے۔ جو اس نے اپنی بیوی ستی کے انتقال پر بہائے تھے۔ اس نظم میں درد اور بے چارگی کی کیفیت سامنے آتی ہے۔ موت ایک ایسا المیہ ہے۔ بقول سارتر یہ باہر سے ہم پر آن ٹوٹتی ہے۔ فرد کی پیدائش اور موت دونوں واقعات کسی کے اختیار میں نہیں پیدائش کے وقت کا تعین تو ممکن ہے۔ مگر موت ہمیں کب آن دبوچے گی اس حوالے سے ہمارا مستقبل مکمل اندھیرے میں ہے۔ موت کا خوف ہر فرد کو ایک کرب میں مبتلا رکھتا ہے موت نہ صرف کرب کا باعث ہے۔ بلکہ موت سے وابستہ دکھ زندگی اور موجود کے تعلق میں مضبوطی کا باعث بنتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری "درد لفظوں میں سانس لیتا ہے۔" کے فلیپ پر لکھتے ہیں۔

> "افتخار بیگ کی نظموں کے اس مجموعے سے میں متاثر ہوا ہوں یہ مجموعہ ہم عصر زمینی زندگی اور اپنی دھرتی پر گزرنے والے صدیوں کے طویل عذاب کی داستان سناتا ہے۔ یہ ایک ایسی داستان ہے۔ جو ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہے۔ زمینی عذاب کی داستان اس کے پرکھوں نے جہاں ختم کی تھی۔ افتخار بیگ نے اس داستان کی اگلی کڑیوں کو بیان کرنا شروع کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے اندر کی رزم گاہ میں گھمسان کا رن مچا ہوا ہے"(12)

ڈاکٹر افتخار بیگ کی نظم "زمین نے کروٹیں بدلیں" میں ۲۰۰۵ء میں آنے والے زلزلے میں ٹوٹ پڑنے والی قیامت کا منظر کچھ یوں بیان کیا ہے۔

ہوا بس یوں، تھکی ہاری زمین نے کروٹیں بدلیں
اُسی لمحے میں دیواروں نے اپنی صورتیں بدلیں
چھتیں لپکیں، زمین کی گود میں چھپنے چلی تھیں وہ۔۔۔۔
مگر وہ بھول بیٹھی تھیں۔
چھتیں دھرتی سے مل جائیں۔۔۔۔۔
تو۔۔۔۔۔سانسیں ہار جاتی ہیں
سبھی رشتے زمین پیوند ہو کر
سانس لیتی زندگی کو مار دیتے ہیں۔
(زمین نے کروٹیں بدلیں)(13)

اس نظم میں زلزلے کی صورت میں موت کا رقص چار سو دکھائی دیتا ہے۔ انسان کی بے بسی اور بے چارگی کا احساس ابھرتا ہے۔ شاعر زلزلے کی بدولت زمین پر گزرنے والے عذاب کی کہانی ہمیں سناتا ہے جب فرد دنیا میں اہمیت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ مگر ہستی کے لیے کی جانے والی ساری کوششیں بعض اوقات لغو محسوس ہوتی ہے۔ تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ

میں شہنشاہ، نہ موسیٰ، نہ میں سامری
میں فقط آدمی، احقر و کمتریں۔۔۔۔ میرا جینا ہے کیا۔۔۔۔۔؟
درد پینا ہے کیا۔
(زندگی)(14)

یہ نظم زمین پر بڑھتی ہوئی پانی کی قلت ماحولیاتی تبدیلیوں پر لکھی گئی ہے۔ انسانیت دم توڑ چکی ہے یہ دنیا جو پیار، محبت، ایک دوسرے کی خیر خواہی کی وجہ سے خوبصورت تھی۔ اب وہ نہیں ہے۔ لہذا اب دنیا لغویت کا شکار نظر آ رہی ہے۔ دنیا کے مختلف علاقے جہاں کے لوگ بھوک اور پیاس سے مر رہے ہیں۔ دنیا اپنا اصل مقام کھو چکی ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں وہ تصویر آتی ہے۔ جب گدھ ایک ناتواں کمزور بچے کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اصل کے لب پیاس کی وجہ سے نیلے پڑ گئے اور خدا بھی ہم سے شاید ناراض ہو گیا ہے۔ کیونکہ ہم نے خدا کے اصولوں کی روگردانی کی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجئے۔

زمین کا چہرہ بگڑ چکا ہے
تمام کھیتوں کی کوکھ سے کچھ

عجیب نیلے سے لب اگے ہیں

تمام ماحول کا مقدر ہے پیاس پیارے

تمام ماحول جل رہا ہے

تمام انسان بلک رہے ہیں

تمھاری آنکھوں سے جانِ جاناں ستارے کیسے ڈھلک رہے ہیں؟

یہ رونا کیسا۔۔۔؟

کہ اب وہ یزداں تو سو چکا جو خزاں رتوں میں بھی معجزوں کی

بشارتیں دے دیا کرے تھا۔(15)

یہ نظم زندگی کی لایعنیت کے بارے میں ہے جس کی وجہ سے زندگی بیگانگی اور مغائرت پیدا ہو گئی ہے گویا زندگی بغیر کسی مقصد اور شوق کے گزاری جا رہی ہے۔ کرب، دکھ، بیگانگی اور مغائرت کی کیفیات بیک وقت ہمیں نظر آتی ہے۔ لایعنیت کا احساس زندگی کی یکسانیت سے جنم لیتا ہے یہ یکسانیت فرد کے ہاں اکتاہٹ کا باعث بنتی ہے۔ اس لایعنیت اور اکتاہٹ کو دور صرف جہد عمل سے کیا جاتا ہے۔ مگر کوشش کرنے کے بعد جب کچھ ہاتھ نہیں آتا تو مایوسی کی کیفیت جنم لیتی ہے یہی کیفیت ہمیں ڈاکٹر افتخار بیگ کی شاعری میں نظر آتی ہے

کہ دل کی داستان سن کے

کسی کی آنکھ میں تارے

کہیں آہ وفغاں سی تھی

زماں کا کام تھا سارا

کوئی انسان کیا کرتا

شعور زندگی کی بات تھی

ایمان کیا کرتا؟

گھٹائیں بانجھ تھیں ساری

نگر میں پھول کیا اگتے، کسی کے پاؤں کیا رکتے

(مایوسی کے لمحوں میں)(16)

جب شاعر کے آنسو بے وقعت اور بے اثر ثابت ہوئے کیونکہ اس کا محبوب روتے دیکھ کر بھی نہ رکا۔ ایسی صورتحال میں جب دعائیں بے اثر ہو جائیں آنسو لایعنی پھر انسان کی زندگی میں خوشی چہ معنی۔ انسانیت کی بے توقیری ہر باشعور اور صاحب علم شخص کو رونا آیا ایسے میں ڈاکٹر افتخار بیگ جیسا حساس شخص اپنی ذات کی تلاش میں شاعری کے صحرا میں بھٹکا تو

چہ عجب۔ ڈاکٹر افتخار بیگ کے ہاں عدم تحفظ کے احساس نے تنہائی، یاسیت اور کرب کی کیفیات نے جنم لیا۔ اپنے عہد کے فرد کی بے بسی اور محرومیوں کا ذکر ان کے ہاں کچھ ملتا ہے۔

جن لوگوں نے، جیون میں خود اپنی راہ بنائی
ان کا جیون اور جیون کی ساری راہیں
کتنی تیرہ ہوتی ہیں
جن کے پرکھوں نے قوم کے لہو کا سودا نہیں کیا
انھیں خود اپنا خون بیچ کر زندہ رہنا ہوتا ہے
(جن کے پرکھوں نے۔۔۔) (17)

ڈاکٹر افتخار بیگ کی شاعری کو پڑھتے ہوئے قاری کے اندر ترحم کے جذبات ابھرتے ہیں اور کسی کہیں یاسیت اور دکھ کے اقدار کی شکست و ریخیت اور عصری تقاضوں نے انہیں فرد کی حقیقی صورتحال کو اجاگر کرنے پر مجبور کیا اور یوں وہ وجودیوں کے پاس آن پہنچے۔

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر افتخار بیگ کی شاعری ایک ایسا تجربہ کراں ہے۔ جہاں دکھ، درد، یاسیت، کرب، تنہائی کے ساتھ ساتھ اثبات ذات کا عنصر بھی ملتا ہے۔ سماجی اقدار کا جبر انہیں بیگانگی اور تنہائی کا شکار کرتا ہے۔ وہ شدید اذیت کا سامنا کرتے ہیں تاہم اس اذیت اور کرب سے ان کے ہاں قنوطیت کی بجائے رجائیت ملتی ہے۔ معاشرے میں بستے والے لوگوں کے دکھ پر ان کی آنکھیں پرنم دکھائی دیتی ہیں اور لوگوں کو اس مشکلات، مصائب اور دکھوں سے نکالنے کی بھی تدبیر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

نظم کے حوالے سے ان کی شاعری کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے انہوں نے زیادہ تر آزاد اور پابند دونوں طرح کی نظمیں لکھیں۔ افتخار بیگ کے ہاں علامتوں اور استعاروں کا بھرپور استعمال ملتا ہے، جو نئی بھی ہیں اور برمحل، اچھوتی بھی۔ یہ علامات ہمیں عمیق فلسفیانہ فکر سے روشناس کروانے کے وسیلے کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔ گرد ہوتے ہوئے موسم، بانجھ ہوائیں، جیون زمانہ کھونا، مہیب آسیب، اندھی فصیلیں اور سہمی سہمی کرنیں وغیرہ یہ علامات و استعارات نہ صرف ان کے کلام کو چار چاند لگاتے ہیں بلکہ فکری نہج کا بھی پتا دیتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔افتخار بیگ، ڈاکٹر، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت، فیصل آباد، مثال پبلشر، 2009ص28

2-Kierkegaard, Soren, Concluding Unscientific Postscript, Trans. D.F. Swenson (1941 Princeton), p 26.

3۔افتخار بیگ، ڈاکٹر، درد لفظوں میں سانس لیتا ہے۔"پیش لفظ، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۶، ص ۱۳

4۔ ایضا، ص78

5-Macquarrie, John, "Existentialism", Penguin Books Ltd. England, 1980, pg. 70.

6۔ ایضا، ص134

7۔ ایضا، ص125

8۔ قاضی عابد، وجودیت اور انسان دوستی، ترجمہ، لاہور، مشعل پبلیکشنز، لاہور، ص ۲

9۔ ایضاً، ص71

10۔ ایضاً۔ ص141

11۔ ایضا، ص141

12۔یضا ، ص164

13۔ ایضا، فلیپ، درد لفظوں میں سانس لیتا ہے۔

14۔ ایضا، ص89

15۔ ایضا، ص74

16۔ ایضا، ص109

17۔یضا، ص147

References:

1. Iftikhar Baig, Dr., Majid Amjad ki Sha'iri aur Falsafa-e-Wujoodiyat, Faisalabad, Misal Publishers, 2009, p. 28.
2. Kierkegaard, Soren, Concluding Unscientific Postscript, Trans. D. F. Swenson, Princeton, 1941, p. 26.
3. Iftikhar Baig, Dr., Dard Lafzon Mein Saans Leta Hai, Pesh Lafz, Faisalabad, Misal Publishers, 2016, p. 13.
4. Ibid., p. 78.

5. Macquarrie, John, "Existentialism", England, Penguin Books Ltd., 1980, p. 70.
6. Ibid., p. 134.
7. Ibid., p. 125.
8. Qazi Abid, Wujoodiyat aur Insan Doosti, Translated, Lahore, Mashal Publications, n.d., p. 2.
9. Ibid., p. 71.
10. Ibid., p. 141.
11. Ibid., p. 141.
12. Ibid., p. 164.
13. Ibid., Faleep, Dard Lafzon Mein Saans Leta Hai.
14. Ibid., p. 89.
15. Ibid., p. 74.
16. Ibid., p. 109.
17. Ibid., p. 147.